ماہنامہ

لاہور

حکمتِ قرآن

مدیر مسئول:

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۸۵۲۶۱۱

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے پی ایچ ڈی - ڈی لٹ (مرحوم)

رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ
بمطابق
جولائی ، ۱۹۸۳ء
جلد دوم ، شمارہ ۵

مدیر اعزازی
ڈاکٹر ابصار احمد
ایم اے - ایم فل - پی ایچ ڈی)

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید
(ایم اے فلسفہ)

فہرست

حکم و عبر ——— ۳
ڈاکٹر ابصار احمد

الٓمّٓ (سورہ صٓ) ——— ۷
ڈاکٹر اسرار احمد

اسرارِ لا الٰہ بزبان اقبال ——— ۱۴
چوہدری مظفر حسین

اسلامی نظریہ تعلیم اور ہماری فروگذاشتیں ۲۵
پروفیسر خواجہ غلام صادق

علامہ اقبال اور کتاب زندہ ۳۱
پروفیسر مرزا محمد منور

سائنس اور تبلیغ اسلام ۳۷
چوہدری مظفر حسین

ابوالکلامیات (انسان کی حیات صالحہ اور اس کی طبعی) ۴۴
ڈاکٹر شیر بہادر پنی

از مطبوعات: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور - ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

طابع: ایس اے سلیم مطبع: آفتاب عالم پریس، لاہور

زرِ سالانہ: -/۲۰ روپے، اس شمارے کی قیمت -/۲ روپے

آپ کے احباب کے لیے بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

"مُسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفتاً پیش کیجیے

دورانِ ماہِ رمضان اہل وعیال اور اعزّہ واقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجیے!

(نوٹ) اس کتابچے کا انگریزی اور عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، فارسی ترجمہ زیرِ طباعت ہے۔
اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے!

شائع کردہ

مرکزی انجمن خُدّامُ القرآن (رجسٹرڈ)

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۲۶۱۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حکمت و عبر

قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جسے حکمت عطا کی گئی، اسے خیر کثیر عطا کی گئی - با لفاظ دیگر از روئے قرآن حکمت و دانائی کا کسی بندے کو عطا کیا جانا 'خیر کثیر' عطا کئے جانے کے مترادف ہے - اس اہم قرآنی صراحت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے جملہ مضمرات پر غور کریں اور بالخصوص یہ بات جاننے کی کوشش کریں کہ حکمت کا اصل مفہوم و معنیٰ کیا ہے -

یہ امر تمام اصحاب فکر کے نزدیک مسلم ہے کہ جو صلاحیت انسان کو دوسری تمام ذی حیات مخلوقات سے ممیز کرتی ہے وہ اُسکی تعقل و تفکر کی صلاحیت ہے - یعنی انسان اپنی داخلی کیفیات اور خارجی احوال و ظروف کا صرف شعور و احساس ہی نہیں رکھتا بلکہ ان کا علم علّت و معلول، تعمیم اور دوسرے منطقی رشتوں کے حوالے سے کرتا ہے یعنی وہ ان کا اُدراک کرتا ہے - یا یوں کہیئے کہ وہ مختلف واقعات و موجودات کو انکے پورے سیاق و سباق، مالہ اور ماعلیہ کی تفصیلات اور نہائی غایتوں (ULTIMATE PURPOSES) کی تفہیم کے ساتھ کرتا ہے - وہ ہر چھوٹی اور حقیر شئے کے بارے میں بھی یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اس کا ماخذ و منبع کیا ہے، کون سے عوامل اس کی ترقی یا تنزل میں کارفرما ہیں اور بالآخر اس پوری کائنات کی سکیم میں کیا رول ادا کرتی ہے - یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس اعتبار سے سائنسدان کو بھی حکمت کا متلاشی کہا جا سکتا ہے - کیونکہ وہ بھی مختلف اشیاء، عناصر اور کائنات کی ماہیت و حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بات تمام سائنسدانوں اور ماہرین علم طبیعیات و فلکیات کے بارے میں صحیح نہیں ہے کیونکہ ان میں سے اکثر کی توجہات عملی مسائل پر مرکوز ہوتی ہیں اور وہ اشیاء کی تفہیم سے زیادہ ان کے عملی استعمالات

وفوائد میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کا ہدف بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ قدرتی قوانین کو دریافت کریں، عناصر کی خوابیدہ قوتوں کو مبرہن کر کے انہیں عملی استعمال میں لائیں اور اس طرح انہیں انسانی زندگی کے لئے سہولت و آسائش کا باعث بنائیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانی میں بعض نامور سائنسدان ایسے بھی ہوئے ہیں جو سائنس کے محدود دائرہ کار سے نکل کر حقیقت کے بارے میں ایک مابعد الطبیعاتی رائے قائم کرتے ہیں۔ اور اشیاء و عناصر کی ابتدا اور انتہا اور غایت اولیٰ کے بارے میں سوچ بچار کرتے ہیں اور اسطرح وہ یقیناً حکماء اور فلاسفہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

سطور بالا سے ایک بات یہ واضح ہوئی کہ حکمت کا تعلق صرف ذہانت (INTELLIGENCE) اور عملی مہارت (PRACTICAL SKILL) سے نہیں۔ بلکہ اصلاً اس کا تعلق فلسفیانہ غور و فکر اور مابعد الطبیعاتی تفہیم سے ہے۔ ثانیاً حکمت و بصیرت ایک انتہائی جامع اور بسیط تصور ہے کائنات اور انسانی زندگی کے تمام پہلو اور تفاصیل اس کے ذیل میں آتی ہیں۔ چنانچہ اس نقطہ نظر سے خود مذہبی عقائد کے بارے میں قرآن کا موقف یہ ہے کہ انہیں پورے شعور اور غور و فکر کے ساتھ اپنایا جائے۔ دُنیائے عیسائیت کی طرح کا اندھا عقیدہ (BLIND FAITH) قرآن کو مطلوب نہیں ہے۔ قرآن کریم عقائد اور احکام کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان تمام کی غرض و غایت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس کا مقصد واضح طور پر یہ ہے کہ ایک مومن پورے اطمینان قلب اور عقلی بصیرت کے ساتھ ان عقائد و احکام کو مانے۔ اور اُنکی حیثیت قطعاً بے عقل یا خلاف عقل قضایا (DOGMATIC PROPOSITION) کی نہ ہونی چاہیئے۔

لیکن دوسری طرف ہمیں یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جس حکمت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے وہ دُنیائے فلسفہ کے تعقل و تفکر محض کے مترادف نہیں ہے۔ بالخصوص مغربی فلاسفہ میں تحلیلی اور ایجابی نقطہ نظر رکھنے والے مفکرین نے اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں فکر و دانش

کی حدود کو سکیڑنے کا عمل مسلسل جاری رہا ہے یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں کم از کم انگریزی دان فلسفیوں کے ہاں اب صورت حال یہ ہے کہ بہت سی فلسفیانہ اصطلاحیں جو ماضی میں انتہائی گہرے اور وسیع مفہوم رکھتی تھیں۔ اب فضول اور لایعنی کہہ کر رد کر دی جاتی ہیں۔ حکمت یا WISDOM کا لفظ بھی اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ لسانی اور تحلیلی مفکرین کی نگارشات میں ہمیں لفظ 'حکمت' پر بالعموم کوئی بحث نہیں ملتی۔ بلکہ اسے تحلیلی اور منطقی فکر یا مختلف تعقلات کی جانچ پرکھ سے متعلق ایک علمی کاوش تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ کا اثر فلسفہ مذہب پر بھی ہوا۔ نتیجتاً جدید مفکرین کے خیال میں مذہب اور مذہبی عقائد صرف چند مذہبی اور مابعد الطبیعاتی تصورات اور تعقلات کا مجموعہ بن کر رہ گئے۔ اور تمام کاوش اس بات پر صرف کی گئی کہ آیا یہ تعقلات اور تصورات عقلی اور منطقی اعتبار سے قابل قبول ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اس طرح مذہب کے دوسرے اہم پہلوؤں کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے۔ مثلاً مذہبی عقائد کا انسان کے وجودی و جذباتی احساسات کے ساتھ تعلق و ربط، اس اعتبار سے مذہب صرف چند مابعد الطبیعاتی قضایا کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ انسان کے انتہائی اہم آفاقی احساسات کا جواب اور ان کو مربوط شکل میں پیش کرنے کی سعی کا نام ہے۔ انیسویں صدی کی دنیائے عیسائیت میں اس اہم حقیقت کی طرف کرکیگارڈ نے توجہ مبذول کروائی، جب ہیگل کے فلسفہ کے تحت مذہب بے جان اور خشک منطقی قضایا کا تانا بانا بن کر رہ گیا تھا۔ کرکیگارڈ نے اپنی کئی تصانیف میں انتہائی مؤثر انداز میں یہ واضح کیا کہ مذہب بنیادی طور پر خدا اور بندے کے درمیان ربط و تعلق کا نام ہے اور اس میں عقلی تعقلات سے زیادہ جذبات اور احساسات کو دخل حاصل ہے۔

راقم الحروف کے خیال میں قرآنی نقطۂ نظر بھی مؤخر الذکر فلسفیانہ مکتب فکر کے قریب تر ہے۔ کیونکہ قرآن میں بعض اہم مقامات پر جہاں ایمان کی حقیقت اور اس کے استدلال کے بارے میں آیات آئی ہیں، تفکر کے ساتھ ذکر کی بات بھی کی گئی ہے۔ یعنی از روئے قرآن صرف وہی فکر رسا ہو سکتا ہے اور رب

کائنات کی طرف صحیح طور پر راہنمائی کر سکتا ہے جس میں تفکر کے ساتھ ساتھ ذکر کا انتہائی اہم عنصر بھی شامل ہو۔ چنانچہ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۹۰-۱۹۱ میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و رفت میں اہل عقل کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں، ان کے لئے جو کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اس آیت قرآنیہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ از روئے قرآن، فکر اور ذکر، باہم دگر متعلق ہیں۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو ایک شعر میں بڑے خوبصورت انداز میں سمویا ہے ؎

فقہِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سورۃ صٓ) چوتھی قسط

ڈاکٹر اسرار احمد

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
صٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۝ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ
وَّشِقَاقٍ ۝ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا
وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ
السلام علیکم ! احمدہٗ و اُصلّی علیٰ رسولہ الکریم ط

اما بعد :-

قرآن حکیم کی سُورتوں میں سے جو سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں ان میں تیسری سوُرت جو ایک ہی حرف سے شروع ہوتی ہے سُورہ صٓ ہے-۸۸ آیات اور ۵ رکوعات پر مشتمل یہ سورہ مبارکہ قرآن حکیم میں ۲۳ ویں پارہ میں واقع ہوئی ہے - اس میں بھی حرف مقطع کے فوراً بعد قرآن حکیم کی قسم کھائی گئی ہے -

صٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۝

سُورہ نٓ میں قرآن مجید کو ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ قرار دیا گیا - سورہ قٓ میں فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ فرما کر تذکیر کا ذریعہ قرآن حکیم کو قرار دیا گیا - اور اس تیسری سورہ مبارکہ میں قرآن مجید کی جب قسم کھائی گئی تو اس کا وصف ہی یہ قرار دیا گیا کہ وہ ذکر یعنی نصیحت

اور یاد دہانی کی حامل کتاب ہے - یہ سراسر نصیحت اور یاد دہانی پر مشتمل ہے - واضح رہے کہ ذکر کے عام طور پر اگرچہ معنیٰ نصیحت کر دیئے جاتے ہیں - لیکن اس کا اصل مفہوم ہے یاد دہانی - اور اس سے اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ قرآن مجید جن حقائق کی تبلیغ کر رہا ہے جن کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے، وہ درحقیقت فطرت انسانی میں مضمر ہیں - صرف ماحول کے غلط اثرات کی وجہ سے ان پر ذہول و نسیان کے پردے پڑ جاتے ہیں - آیات قرآنی ان پردوں کو اٹھاتی ہیں - دل پر آئے ہوئے زنگ کو دور کرتی ہیں - اور وہ شہادتیں جو فطرت انسانی میں مضمر ہیں، وہ حقائق جو قلب کی گہرائیوں میں موجود ہیں، انہیں اجاگر کرتی ہیں - یہ ہے عمل تذکیر - چنانچہ اس سورہ مبارکہ کے آغاز میں ہی فرمایا -

صٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۚ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۚ

صٓ، قسم ہے نصیحت اور یاد دہانی سے بھرے ہوئے قرآن کی لیکن یہی لوگ جو کفر کر رہے ہیں، جو انکار کر رہے ہیں، اس دعوت کو ماننے سے اعراض کر رہے ہیں تو وہ یہ سب کچھ ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اور تکبر کی وجہ سے کر رہے ہیں - ایسا نہیں ہے کہ خود ان کا دل گواہی نہ دے رہا ہو کہ حقائق وہی ہیں کہ جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے -

اس سے قبل کے بیان میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ہمارے دین کے بنیادی معتقدات میں سے اصولی اعتبار سے جو سب سے اہم عقیدہ ہے وہ عقیدۂ توحید ہے - لیکن عملی اعتبار سے سب سے زیادہ مؤثر عقیدہ عقیدۂ آخرت ہے -

سورہ قٓ میں پوری بحث ایمان بالآخرہ پر تھی - اس سورۂ مبارکہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر توحید کا ذکر ہو رہا ہے - چنانچہ وہاں تو یہ الفاظ آئے

تھے ۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝

اس کے مقابلے میں یہاں الفاظ نوٹ کیجئے ۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝

" وہ لوگ بڑے تعجب کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہماری ہی طرح گوشت پوست سے بنا ہوا انسان ہماری ہی طرح جس پر بچپن اور نوجوانی اور جوانی کے دور آئے ہیں ۔ وہ ہماری طرف رسول ہو کر مبعوث ہوئے " پہلا تعجب تو انہیں اس پر تھا اور دوسرا تعجب یہ کہ "کس قدر عجیب بات ہے کہ اس نے تمام الٰہوں کو بس ایک الٰہ میں گم کر دیا ۔"

ہمارے اتنے الٰہ تھے، ہمارے آباؤ اجداد جن کو مانتے چلے آ رہے تھے کتنی دیویاں کتنے دیوتا کتنے اِلٰہ لات، منات اور ہبل آخر کہاں گئے ۔ انہوں نے تو ان سب کی نفی کر دی ۔ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۝

تمام الٰہوں تمام خداؤں کو اس نے تو ایک خدائی کے اندر مدغم کر دیا ۔ سب کی نفی ہو گئی اور صرف ایک خدائے واحد کا اقرار لا الٰہ الا اللہ ـــــ ان کا یہ تبصرہ تھا جو وہ دعوتِ محمدی اور دعوتِ توحید پر کرتے تھے ۔ اور کہتے تھے ۔

اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ

اور یہ بڑی عجیب بات ہے کبھی یہ بات سننے میں نہیں آئی — یہاں سے اس سورہ مبارکہ میں عقیدہ توحید پر گفتگو شروع ہوتی ہے - اس طرح جو مشرکین کے لیڈر تھے، ان کے چوہدری تھے وہ کس طرح اپنے عوام کو ورغلاتے رہے کہ اپنے جو معبود ہیں جن کو تم مانتے چلے آرہے ہو تمہارے آباؤ اجداد کے دیوی اور دیوتا ان کے ساتھ پوری وفاداری کا وعدہ کرو - بڑے صبر کے ساتھ اپنے آبائی عقائد پر جمے رہو - جس کا ذکر قرآن ان الفاظ سے کرتا ہے -

"وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ -

اس کے بعد ذکر کیا گیا ان اقوام کا جن کے پاس یہی دعوتِ توحید پہنچی اور انہوں نے جب شرک سے باز آنے اور توحید کو قبول کرنے سے انکار کیا تو عذاب خداوندی کے کوڑے انکی پیٹھ پر برسے - اور وہ قومیں ہلاک کر دی گئیں - نیست و نابود کر دی گئیں اور نسیاً منسیاً کر دی گئیں جیسا کہ متعدد مقامات پر فرمایا :

كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا — ایسے ہو گئیں جیسے کبھی وہ تھیں ہی نہیں - قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، قوم شعیب، آل فرعون - ان کا ذکر قرآن حکیم کی طویل سورتوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ آیا ہے - ان ابتدائی سورتوں میں ان کی طرف صرف اشارات ہیں -

اس کے بعد ذکر ہوتا ہے اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کا جو علم و حکمت کی بلندیوں پر فائز تھے - جنہیں اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت حاصل تھی - جنہیں ہم انبیاء کرام کے نام سے موسوم کرتے ہیں - ان کا ذکر شروع ہوا -

ان میں سب سے پہلے ذکر ہوا حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا — انؑ پر اللہ کا اتنا فضل ہوا کہ وہ بادشاہ بھی تھے اور اللہ کے بندے اور نبی بھی اور انتہائی شکر گزار بندے - ان کے دل میں اللہ کی جو محبت اور شوق تھا اس کا ظہور ہوتا تھا جب وہ رات کے پچھلے پہر مناجات کرتے

تھے اور اس سوز کے ساتھ اور اتنے حسین ذوق اور پُر تاثیر لحن کے ساتھ کہ پہاڑ اور پرندے بھی اس مناجات میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔

پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہے جو صاحبِ زادے ہیں حضرت داؤد کے۔ کہ ان کو اللہ نے اقتدار عطا فرمایا۔ غلبہ عطا فرمایا۔ ان چیزوں پر غلبہ کہ جن کی انسانی تاریخ میں ہمیں گواہی نہیں ملتی کہ اس طرح پر ایک انسان میں جمع کر دی گئی ہوں۔

اس کے بعد ذکر آتا ہے اس ذات کا جس کا نام صبر کے لئے ضرب المثل بن چکا ہے۔ یعنی حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔ جنہوں نے ساری مشکلات جھیلیں۔ جان و مال کی ہر تکلیف اور ہر ضیاع کو گوارا کیا۔ یہاں تک کہ بیماری اور بڑی ہی تکلیف دہ بیماری برداشت کی۔ لیکن اللہ کے ساتھ صبر و شکر کا رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا۔

پھر ذکر آتا ہے ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پھر ان کے بیٹے حضرت اسحاق اور ان کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کا پھر ذکر آتا ہے حضرت ابراہیم کے دوسرے اور بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کا پھر حضرت الیسع کا۔ حضرت ذوالکفل کا۔ ان سب کا ذکر ہے اور درحقیقت اس طرح ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے کفارِ قریش کے سامنے ——— ایک تمہارا کردار ہے۔ اور ایک یہ کردار ہے یہ بھی اللہ کے بندے تھے یہ بھی اسی طرح گوشت اور پوست کے بنے ہوئے تھے۔ جتنے بھی رسُول پہلے آئے ہیں وہ بھی بہرحال انسان ہی تھے تمہاری ہی طرح کھاتے پیتے بھی تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں چنا اپنے پیغام کی رسالت کے لئے اور جن قوموں نے انکی دعوت کو لبیک کہنے سے انکار کیا۔ ان کا جو انجام ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک آیت مبارکہ آتی ہے۔ جس کا تعلق اس

سورہ مبارکہ کی پہلی آیت صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ سے ہے فرمایا:
کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَ
لِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝
"اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کتاب قرآن مجید جو ہم نے آپ
پر نازل کی ہے بہت برکت والی ہے۔ بڑی شان والی ہے اور
یہ کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ لوگ اسکی آیات پر غور و فکر
کریں، تدبر کریں سوچ بچار کریں۔ اسکی گہرائیوں میں غوطہ زنی
کی کوشش کریں"
بقول علامہ اقبال مرحوم
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ!

پھر وہی لفظ تذکر آگیا۔ جس سے گفتگو شروع ہوئی تھی: صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ۔ اس آیت میں ہدایت آگئی کہ لوگ اس کے ذریعے سے نصیحت حاصل کریں۔ اس سے علم و ہدایت پائیں۔ اس سے یاد دہانی اخذ کریں۔

آخر میں نسل انسانی کے آغاز کا وہ واقعہ آرہا ہے۔ کہ جس سے اس پوری تاریخ انسانی کے دوران حق و باطل کی کشمکش اور خیر و شر کے تصادم کا راز کھلتا ہے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، ان کو مسجود ملائکہ بنانے کا معاملہ اور مرحلہ اور شیطان لعین ابلیس کا انکار، تکبر کی بنیاد پر — گویا یہاں آئینہ رکھ دیا گیا کہ وہ سرداران قریش جو تکبر کی بنیاد پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے سے انکار کر رہے ہیں، یہ اسی شیطان کے پیرو ہیں جس نے تکبر کی بنیاد پر کہا تھا۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ میں آدم سے بہتر ہوں خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ مجھے تو نے آگ سے بنایا اور اسکی تخلیق مٹی سے کی۔ میں اس سے بہتر ہوں لہٰذا اس کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ وہ شیطان

یعنی ہے در حقیقت جس کے پیرو کار ہیں وہ لوگ جو قرآن کی دعوت پر کان نہیں دھر رہے اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوتِ حق سے اعراض کر رہے ہیں۔

اللّٰھم ربنا لا تجعلنا منھم

اللہ ہمیں اس سے بچائے کہ ہم کسی بھی اعتبار سے ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں۔ قرآن سے اعراض کریں اس پر تدبر نہ کریں۔ اس پر غور و فکر نہ کریں۔ اس سے سبق حاصل نہ کریں اس سے نصیحت اخذ نہ کریں۔ اسے اپنا مام اور راہنما نہ بنائیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کتاب کا حق ادا کریں۔ اور اس سے ستفادہ کریں جیسا کہ استفادے کا حق ہے۔

بارک اللہ لی و لکم فی القرآن العظیم و نفعنی و ایاکم بالآیات و الذکر الحکیم ۰

چوہدری مظفر حسین

اسرارِ لا الٰہ بزبانِ اقبال مرحوم

روایت ہے کہ ایک بار علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ دردِ گردہ کی شدید تکلیف میں مبتلا ہوئے تو صعوبتِ مرض اور اندیشہ ہائے گوناگوں سے بیقرار ہو کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کی :

دہ مرا فرصتِ ھوحق دو سہ روزے دگرے
کہ دریں دیرِ کہن بندہ بیدار کجاست

(مجھے دو تین روز کی اور فرصتِ ہو حق یعنی تجھے یاد کرنے کی فرصت دے کہ اس دنیا میں بندہ بیدار (میرے سوا) اور کہاں ہے)

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

(میر اور مرزا دل اور دین کی سیاست میں حواس باختہ ہوئے ہیں سوائے برہمن زادے کے اس کے اسرار کو جاننے والا کہاں ہے)

اندریں عصر کہ لَا گفت مَنْ اِلَّا گفتم
بیں چنیں دیدۂ دہ بیں بہ شبِ تار کجاست

(اس زمانے میں کہ سوائے میرے اور کوئی اِلَّا کہنے والا نہیں اس طرح کا راستے کو جاننے والا اس اندھیری رات میں کہاں ہے)

حرفِ ناگفتہ محال نفسے می خواھد!
ورنہ ما را بہ جہانِ تو سر و کار کجاست

(وہ بات جو ابھی کہی نہیں گئی صرف ایک سانس کی
مہلت چاہتی ہے ورنہ مجھے تیرے جہاں سے کیا سروکار ہے)

یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ سورۂ ابراہیم میں کلمۂ طیبہ کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی ہے وہ علامہ اقبالؒ کو بے حد محبوب تھی اور اس آیت سے ان کے خصوصی شغف کے پیشِ نظر آپ کے عقیدت مندوں نے اسے آپ کے مزار کی چھت پر کندہ کروا دیا۔ چنانچہ جس حرفِ ناگفتہ کے بیان کے لئے آپ دو سہ روزے دگرے کی مہلت مانگتے رہے وہ ان کی وفات کے بعد بھی اس قرآنی آیت کے حوالے سے ہمیں دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے۔ شاید قدرت نے یہ انتظام ہی اس لئے کیا ہے کہ کلمہ طیبہ کی تخم ریزی سے ضمیرِ انسانی میں پھوٹ کر برگ و بار لانے والی شخصیت کا جو تصور علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں خودی کی اصطلاح کے حوالے سے پیش کیا تھا وہ اس قرآنی آیت کے حوالے سے زائرینِ مزارِ اقبالؒ کے ہمیشہ پیشِ نظر رہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ
بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

قرآنِ حکیم میں اس کے بعد ایک آیت چھوڑ کر جو کلمہ خبیثہ کے بارے میں ہے سلسلۂ کلام پھر کلمۂ طیبہ کی طرف عود کرتا ہے۔ لیکن یہاں کلمۂ طیبہ کے بارے میں قولِ ثابت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ نظریۂ حیات، جس کے مقابلے میں کسی باطل نظریۂ حیات (کلمۂ خبیثہ) کو قرار حاصل نہیں، مومنین کو دنیا اور آخرت میں ثبات بخشتا ہے۔ البتہ عملِ صالح شرط ہے کلمۂ طیبہ کے پنپنے کی [illegible]

اَلْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں اکثر و بیشتر کلمۂ طیّبہ ہی کی تشریح و تفسیر کی ہے، وہ خود فرماتے ہیں

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

یعنی وہ دورِ حاضر کی لادینی فضا میں اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہی سخن سنج ہیں: اندریں عصر کہ لا گفت من الا گفتم

یوں تو ہم سبھی کلمۂ طیّبہ کا حلف اٹھا کر ہی مسلمان ہوتے ہیں مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو کلمۂ طیّبہ کے ان مضمرات و متضمنات سے آگاہ ہوں، جن کو اس "محرم اسرار" نے مشکلاتِ لا الٰہ سے تعبیر کیا ہے۔

چو میگویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلات لا الٰہ را!

اس لئے علامہ اقبالؒ نے ہمیں بار بار کلمۂ طیّبہ کی معنویت پر غور کرنے کی دعوت دی ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اس کے عملی اطلاقات پر شدّت سے اصرار کیا ہے۔

آپ کے کلام میں اس کلمے کا تکرار بکثرت پایا جاتا ہے لیکن ہر کہیں اس کی تشریحات و توضیحات میں جدّت، تنوّع، برجستگی اور تازگی کی وہ کیفیت ہے کہ اس کی نظیر ہمارے پورے دینی لٹریچر میں ملنی محال ہے۔ ہمارے علماء میں سے کسی نے بھی کلمۂ طیّبہ کی تشریح و تفسیر اس جامعیت کے ساتھ نہیں کی جیسی کہ علامہ اقبالؒ نے کی ہے۔ کیونکہ ان کا فکری تار و پود تمام تر کلمۂ طیّبہ کا ہی رہینِ منّت ہے۔

یہاں کلمۂ طیّبہ کے بارے میں علامہ اقبالؒ کی تمام تصریحات کا تفصیلاً جائزہ لینا ممکن نہیں اس لئے چند ضروری نکات کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے جو ان کے کلام کے سرسری مطالعہ سے مترشح ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے ایک بنیادی بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو کلمۂ طیّبہ کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے طرزِ فکر کی امتیازی خصوصیت ہے کلمۂ طیّبہ کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار ہے اور

دوسرے حصے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا۔ اپنی الگ الگ جگہ پر بھی، اور ایک دوسرے سے مربوط ہو کر بھی، دونوں ٹکڑے یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن کلمے کی تشریح میں یہ اکثر ہوا ہے کہ صرف ایک ہی ٹکڑے پر زور دینے کی وجہ سے دوسرے ٹکڑے کی اہمیت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ توحید خالص ہے جس کی نشر و اشاعت کے لئے آپ مبعوث ہوئے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اتنی ہی پکی اور ویسی ہی درست ہے کہ امت مسلمہ کے لئے تعلیمات الٰہیہ کا خلاصہ اتباع محمدؐ ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا۔ گویا کلمۂ طیبہ کا پہلا ٹکڑا نظریۂ زندگی ہے تو دوسرا ٹکڑا اس نظریۂ زندگی پر مبنی طرز زندگی۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ کلمۂ طیبہ کا آخری جزو محمد رسول اللہ بھی وحدانیت ہی کی تصدیق و تکمیل ہے اور محمد رسول اللہ کے معنی یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اللہ (یعنی معبود) نہیں ہیں تو یہ بات اپنی جگہ درست ہونے کے باوجود اس خطرے سے خالی نہیں ہے کہ اس سے ایسا طرز فکر پیدا ہو کہ قرآن پہنچا دینے کے علاوہ (معاذ اللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ کوئی حیثیت ہے نہ فضیلت۔ لیکن اگر محمد رسول اللہ کی تشریح یوں کی جائے کہ آپؐ ہی ہمارے لئے خدا تک کا ناگزیر واسطہ ہیں تو آپؐ کے بارے میں خیالات، احساسات اور جذبات میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اور ہمارے دل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و تعظیم، توقیر و احترام اور سپاس و شکرگزاری سے لبریز و سرشار ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے انداز فکر کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ آپ نے کلمۂ طیبہ کے دوسرے ٹکڑے کے معانی بیان کرنے میں منفی پہلو سے زیادہ مثبت پہلو کو سامنے رکھا ہے اور اپنے کلام میں اس بات کا پورا پورا التزام کیا ہے کہ انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک تمام مسائل پر کلمۂ طیبہ کے اطلاق میں دونوں ٹکڑوں کی یکساں اطلاقی حیثیت واضح ہو۔

اس ضروری تمہید کے بعد ہم علامہ اقبالؒ کے تصورِ خودی کی طرف آتے ہیں جو درحقیقت کلمۂ طیبہ ہی کی اخلاقیاتی تشریح ہے۔ اپنے کلام میں خودی کا لفظ اخلاقی معنوں میں جہاں کہیں بھی استعمال کیا ہے اس کا مطلب اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اتباع کے سوا اور کچھ نہیں۔ "ارمغانِ حجاز" میں، جو علامہ اقبالؒ کا آخری مجموعہ کلام ہے، ملّت سے خطاب کر کے پیامِ خودی کو مختصر ترین الفاظ میں یوں سمیٹتے ہیں:

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو — دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر — بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

نئے چاند کی طرح اپنی منزل کے حصول میں کوشش کئے جا اس نیلی فضا کے اندر ہر گھڑی آگے بڑھتا رہ۔ اگر تو اس جہاں میں اپنا مقام چاہتا ہے تو اللہ سے دل بستگی پیدا کر اور سرورِ کائنات کے راستے پر گامزن ہو جا۔

اس قطعہ میں "بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو" کا مصرع درحقیقت کلمۂ طیبہ ہی کی اخلاقیاتی تشریح و تعبیر ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک انسان کی سب سے زیادہ قیمتی متاع اس کی شخصیت ہے اور شخصیت ان کے فلسفے کی زبان میں نام ہے ایک خاص قسم کے تناؤ یا اضطراب کا (A PARTICULLAR STATE OF TENSION) یہ اضطراب یا تناؤ اپنے حوالی کے ساتھ عمل و تعامل میں کسی خاص موقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے پر ہی برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اور کلمہ طیبہ درحقیقت اعلان ہے زندگی میں ایک خاص موقف کو اختیار کرنے اور اس پر استقامت سے ڈٹے رہنے کا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ لا الٰہ کا کلمہ ایک کلمۂ تسخیر ہے جو فطرت کی تمام قوتوں پر سے الوہیت کا لباس اتار پھینکتا ہے۔ اور انسان کے بیرونی تجربات میں تنقیدی مشاہدہ کی روح کو بیدار کر کے اسے تسخیرِ عالم پر ابھارتا ہے۔ اسی طرح سے ایک کلمۂ بغاوت بھی ہے جو اسے انسانوں کی ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاتا ہے (لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ) جب کہ الا اللہ ایک کلمہ اقرارِ اطاعت ہے جو انسان کا رشتہ ایک ایسے ربّ السمٰوٰت

والارض سے جوڑ دیتا ہے جس کی رفاقت میں وہ ہر قسم کے خوف وغم سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور ترقی و استیلاء کے بلند ترین مدارج کی آرزو کر سکتا ہے اور محمد رسول اللہ وہ کلمۂ دریافت ہے جس میں انسان کے لئے وہ ساری رہنمائی موجود ہے جس کی اسے احتیاج ہے اور جس نمونہ پر ڈھل کر بالفعل وہ تمام مقامات بلند اس کی دسترس میں آتے ہیں جن کی اسے آرزو ہے۔ نیز یہ ایک ایسا کلمۂ آزادی ہے جو اسے ہر قسم کی روحانی غلامی سے نجات دلاتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وحی کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے منقطع ہونے کی وجہ سے ہر باطنی واردات آزادانہ تنقید پر پرکھی جانے کے قابل ہے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ باطنی واردات کی بنا پر لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کرے۔ کلمہ طیبہ کے دونوں حصے مربوط ہو کر انسانی آزادی کا ایک ایسا تصور دیتے ہیں اور انسان کو فطرت اور انسانوں کی غلامی سے آزادی دلا کر عرفان ذات کا ایسا شعور بخشتے ہیں جسے ہم ایک نیا جنم لینے یا ایک نئی زندگی سے لذت آشنا ہونے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کلمہ طیبہ پر ایمان رکھنے والے 'مردِ مومن' کے لئے 'مردِ حُر' اور 'مردِ آزاد' کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

حیاتِ اجتماعی میں بھی جسے علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں بیخودی کا نام دیا ہے، کلمۂ طیبہ کی اساسی حیثیت کو بڑے زوردار الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی مثنویات "رموزِ بیخودی"، "مسافر" اور "پس چہ باید کرد" خاص طور پر مطالعہ کرنے کے قابل ہیں۔ کلمۂ طیبہ کی جو توضیحات اور تشریحات علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں مختلف مقامات پر کی ہیں ان کا ایک نہایت مختصر سا جائزہ مختلف عنوانات کے تحت یہاں پیش کیا جاتا ہے

عصرِ حاضر اور مسلمان علامہ اقبالؒ کو شکایت ہے کہ موجودہ دور میں مسلمان تہذیبِ مغرب سے مرعوب

ہونے کی بنا پر اپنی اصل تہذیب سے جس کی بنیاد کلمۂ طیبہ پر اٹھائی گئی تھی، غافل اور بیگانہ ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ کلمۂ طیبہ کی بصیرت بخش روشنی اور عمل انگیز حرارت سے محروم ہو گئے ہیں، لیکن ملتِ مسلمہ کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ انفرادی نشو و نما اور اجتماعی سربلندی کا راز اس کلمہ میں مضمر ہے۔

عصرِ تو از رمزِ جاں آگاہ نیست　　دینِ اُو جز حُبِّ غیر اللہ نیست

تیرا زمانہ جان کے اسرار و رموز سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کا دین غیر اللہ کی محبت کے سوا کچھ نہیں۔

جلوہ اش مارا ز ما بیگانہ کرد　　ساز ما را از نوا بیگانہ کرد

اس کے جلوے نے ہمیں خود سے بیگانہ کر دیا ہم کو خود اپنی ہی لَے سے بیگانہ کر دیا۔

از دلِ ما آتشِ دیرینہ بُرد　　نور و نار لا الٰہ از سینہ برد

اس کا جلوہ ہمارے دل سے پرانی لگی ہوئی آگ بھی لے گیا۔ یہاں تک کہ سینہ سے نور و نار لا الٰہ کو بھی لے اڑا۔

تا انکہ در تکبیر راز بود تست　　حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست

چونکہ تکبیر میں تیری ہستی کا راز ہے۔ لا الٰہ کا یاد کرنا اور پھیلانا ہی تیرا مقصود ہے۔

نئی نسل کے نام پیغام

جاوید نامہ میں "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے نئی نسل کو علامہ اقبالؒ نے جو پیغام دیا ہے وہ شروع اس طرح سے ہوتا ہے کہ مسلمان مائیں اپنے بچوں کو عہدِ طفلی میں لا الٰہ کلمہ سکھا کر ایک انتہائی قابلِ قدر تہذیبی ورثہ، جو دولتِ جاوید ہے منتقل کرتی ہیں۔

دولتِ جاوید از و آموختی　　از لبِ اُو لَا اِلٰہ آموختی

ہمیشہ کی دولت تو نے اس سے پائی اس کے منہ سے تو نے لا الٰہ سیکھا۔

لیکن جوان ہونے پر ان کا فرض ہے کہ وہ اس کلمہ کے عملی مضمرات کا گہرا شعور حاصل کریں اور یہ کلمہ جس قسم کے انداز فکر اور ذہنی رویوں کو پیدا کرتا ہے۔ انہیں اپنائیں اور اپنی عملی زندگی کی بنیاد بنائیں۔

اے پسر ذوق نگاہ از من بگیر　　سوختن در لا الٰہ از من بگیر

اے بیٹے نگاہ کا ذوق مجھ سے حاصل کر۔ لا الٰہ میں کس طرح اپنے آپ کو جلایا جاتا ہے وہ بھی مجھ سے سیکھ

لا الٰہ گوئی؛ بگو از روئے جان　　تا ز اندامت تو آید بوئے جان

تو لا الٰہ کہتا ہے! اس کو دل سے کہہ تاکہ تیرے جسم سے جان کی خوشبو آئے اور معلوم ہو کہ جسم میں جان ہے۔

ایں دو حرف لا الٰہ گفتار نیست　　لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست

یہ لا الٰہ کے دو حرف صرف کہنے کی بات نہیں ہے۔ لا الٰہ بے زنہار تیغ کے سوا اور کچھ نہیں

زیستن با سوز او قہاری است　　لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است

اس کے سوز کے ساتھ جینا قہاری ہے اور لا الٰہ ایک بہت ہی کاری ضرب ہے

قوت (شخصیت سازی)

علامہ اقبالؒ اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے علماء اور خطیب لا الٰہ کے معانی سے ناآشنا ہو گئے اور صرف ورد لا الٰہ پر ہی قانع ہیں، حالانکہ یہ کلمہ قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ اسے اپنا کر ایک ایسی قوی اور مضبوط شخصیت معرض وجود میں آتی ہے جو خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتی۔

اگرچہ پیر حرم ورد لا الٰہ دارد　　کجا نگاہ بندہ تراز پولاد است

اگرچہ پیر حرم لا الٰہ کا ورد کرتا ہے فولاد سے زیادہ کاٹنے والی نگاہ اس کے پاس کہاں ہے۔

گرچہ می آید صدائے لا الٰہ　　آنچہ از دل رفت کے ماند بہ لب

اگرچہ لا الٰہ کی صدا آتی ہے مگر جو بات دل سے نہ ہو اسکا اثر ہونٹ پر کیا رہتا ہے۔

قوتِ سلطان و میر از لا الٰہ ہیبتِ مردِ فقیر از لا الٰہ
بادشاہ اور امیر کی قوت لا الٰہ سے ہے، مردِ فقیر کی ہیبت لا الٰہ سے ہے۔
قبائے لا الٰہ خونیں قبائے است کہ بر بالائے نامرداں دراز است
لا الٰہ کا لباس خونین لباس ہے کہ نامردوں کو یہ پورا نہیں آتا۔
ہر کہ حرفِ لا الٰہ از بر کند عالمے را گم بخویش اندر کند
جو کوئی لا الٰہ کے کلمے کو یاد کر لیتا ہے وہ ایک پورے جہاں کو اپنے اندر گم کر لیتا ہے
کسے کو بر خودی زد لا الٰہ را ز خاکِ مردہ روید اند نگاہ را
جس کسی نے اپنی خودی پر لا الٰہ کو مار لیا وہ مردہ مٹی سے نگاہ پیدا کر دیتا ہے۔
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا است جملہ موجودات را فرماندواست
ہر وہ شخص جو ہاتھ میں "لا" کی شمشیر لئے ہوئے ہے وہ جملہ موجودات کا حاکم ہے۔
زندگی شرح اشاراتِ خودی! لا و الّا از مقاماتِ خودی
زندگی خودی کی نشانیوں کی شرح ہے اور 'لا' اور 'الّا' خودی کے مقامات ہیں۔

قومی زندگی کی بنیاد علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ہماری قومی زندگی کی بنیاد یہی کلمہ ہے۔ اسی توحید کے اقرار سے افراد ایک ملت میں ڈھلتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصود ایک ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کے نام کو دنیا میں بلند کرنا اور اسی اساس پر ملت قوت و شوکت کی سزاوار بنتی ہے۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
اے لا الٰہ کے کہنے والے! جانتے ہو ملت کیا ہوتی ہے ہزاروں آنکھیں ہوتے ہوئے یک نگاہی ہو۔
اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکے است خیمہ ہائے ما جدا، دلہا یکے است
اہلِ حق کا ایک ہی دعویٰ اور ایک ہی دلیل ہے۔ ہمارے گھر اگرچہ جدا جدا ہیں

مگر دل ایک ہیں۔

ذرہ ہا از یک نگاہے آفتاب! یک نگاہ شو تا شود حق بے حجاب

بہت سے ذرے ایک نگاہ سے آفتاب بن جاتے ہیں تو بھی ایک نگاہ بن جا تاکہ تیرے لئے حق بے حجاب ہو جائے۔

ملتے چوں می شود توحید مست قوت و جبروت می آید بدست

جو کوئی ملت توحید میں مدغم ہو جاتی ہے تو اس کے ہاتھ میں قوت و اختیار آجاتا ہے۔

اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ نے کلمہ کے ان مضمرات کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو ملت اسلامیہ کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں

نکتہ میگویم از مردان حال!! امتاں را لا جلال الا جمال

مردانِ حال کی راز کی ایک بات بتادوں امتوں کے لئے لا جلال ہے اور الا جمال ہے۔

لا و الا احتساب کائنات لا و الا فتح باب کائنات

لا اور الا کے ذریعہ کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور لا اور الا کے ذریعے کائنات کے دروازے کھلتے ہیں۔

ملت بیضا تن و جاں لا الہ ساز ما را پردہ گردان لا الہ

ملت بیضا کا وجود لا الہ سے ہے اور لا الہ ہی ہمارے ساز سے پردہ اٹھانے والا ہے۔

لا الہ سرمایۂ اسرار ما رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

لا الہ سرمایہ ہے ہمارے اسرار و رموز کا اور اس کا تعلق ہی ہمارے افکار کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

مابعد الطبیعاتی مضمرات

علامہ اقبال کے نزدیک کلمۂ طیبہ مابعد الطبیعاتی نظریہ کے طور پر سائنس میں روحانیت کا عنصر داخل کرتا ہے۔ اس خیال کو انہوں نے مختلف طریقوں

سے کثرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مہر و ماہ گردد ز سوز لا الٰہ　　　دیدہ ام ایں سوز را در کوہ وکاہ
مہر و ماہ لا الٰہ کے سوز سے گردش میں ہیں۔ اس سوز کو میں نے پہاڑوں اور بیابانوں میں دیکھا۔

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے　　　جہاں روشن ہے نورِ لا الٰہ سے
فقط اک گردش شام و سحر ہے　　　اگر دیکھیں فروغ مہر و ماہ سے

گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گرد راہ　　　گفت جاں؟ گفتم کہ رازِ لا الٰہ
اس نے کہا کہ تن کیا چیز ہے تو میں نے کہا کہ یہ راستے کی گرد سے پیدا ہوا ہے پھر اس نے کہا کہ جان کیا چیز ہے تو میں نے کہا یہ لا الٰہ کا راز ہے۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ　　　انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
دنیا کی ہر گردش لا الٰہ کے نقطہ کے گرد ہوتی ہے اور دنیا کے معاملات کی انتہا لا الٰہ ہے۔

اسلامی نظریہ تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں

پیر وقیصر خواجہ غلام صادق

آج کی اس تقریب سعید میں شرکت میرے لئے فلاح و بخشش کا ذریعہ ہے۔ ایسی تقاریب تواتر سے ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونی چاہئیں۔ اس طرح کی کانفرنسیں وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی طرف ایک مثبت پیش رفت ثابت ہوتی ہیں۔ احیائے دین کے تقاضے پند و نصائح یا خطبات تک ہی محدود نہیں۔ بیسویں صدی کے آخری نصف میں ذرائع ابلاغ عامہ بہت وسیع پیمانے پر اور بڑی سہولت سے اس کرۂ ارض پر بسنے والے لوگوں کو میسّر ہیں۔ اس بنا پر مختلف تہذیبوں کا ٹکراؤ اور اُن میں پایا جانے والا تضاد نوجوان اذہان کو بُری طرح متاثر کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ فلسفہ، نفسیات اور دیگر عمرانی علوم اور سائنس اور ٹکنالوجی میں بہت تیزی سے وسعت پیدا ہو رہی ہے اور ان علوم کی حاصلات بھی مذہبی تصورات پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ان سے پیدا ہونے والا CONFUSION اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مذہبی تصورات کی تشریح اس نئے پس منظر میں از سرِ نو کی جائے تاکہ احیائے دین کے علمی تقاضے پورے کئے جا سکیں۔

تبدیلی صرف علمی سطح پر ہی رُونما نہیں ہوتی۔ سماجی تبدیلی علمی تبدیلی سے کہیں زیادہ گہری اور مؤثر ہوتی ہے۔ سماجی تبدیلی میں رسم و رواج، لوگوں کے رہن سہن کے طریقے، مختلف افراد کا ایک دوسرے سے تعلق، خاندان اور معاشرہ، معاشرہ اور ریاست، بین الاقوامی دباؤ PRESSURE اور

سیاسی گروہ بندیاں، ان تمام امور میں تبدیلی سماجی تبدیلی کے ذیل میں آتی ہے۔ تاریخی عمل کبھی کسی فرد یا قوم کے لیے نہیں ٹھہرتا، وہ تو ہر دم رواں دواں رہتا ہے۔ اور اسی عمل سے معاشرتی زندگی میں سماجی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹیکنالوجی کی حاصلات نے ایک عام شہری کو ایسی سہولیات سے بہرہ ور کیا ہے جو آج سے نصف صدی پہلے ترقی یافتہ ممالک میں خواص کو بھی میسر نہ تھیں۔

آج کا پڑھا لکھا نوجوان زمان و مکان کی قیود کو توڑ کر ایک بین الاقوامی معاشرے کا رکن بن گیا ہے جہاں معاشرتی رشتے اور تمدنی قدریں ہر دم نئے سانچوں میں ڈھلتی رہتی ہیں۔ اس سماجی عمل و ردعمل سے ایک بین الاقوامی تمدن مختلف اقوام میں مضبوط جڑیں پکڑ رہا ہے۔ اور یہ ایک عام نفسیاتی حقیقت ہے کہ ایسی صورت میں ترقی پذیر معاشرہ ترقی یافتہ معاشرے کی تقلید میں اپنی ثقافتی جڑوں سے کٹتا چلا جاتا ہے اس کی اپنی پہچان مخدوش ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر معاشرہ تشخص کے بحران CRISIS OF IDENTITY کا شکار ہو جاتا ہے۔

پرانی طرز زندگی نئے دور کے تقاضوں کے لئے فکری بنیادیں فراہم نہیں کرتی اور اس سے عقیدے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ ضعف ایمان کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال سے پڑھا لکھا نوجوان دوچار ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو غور و فکر نہیں کرتے اور اپنی تنقیدی اور تخلیقی فکر کو زنگ آلود رکھتے ہیں، ان کے لئے ایسے مسائل پیدا نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی لاتے ہیں۔ انکی زندگیاں جماداتی و نباتاتی سطحوں سے آگے نہیں بڑھتیں۔ مگر ایک زندہ و جاوید معاشرہ اپنے تاریخی اور ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھتے ہوئے نئی SYNTHESIS کو بھی اپنے اندر سموتا ہے۔ اس SYNTHESIS کی ایک علمی سطح ہے اور ایک عملی سطح

جبتک عمل کو علم پر استوار نہ کیا جائے اس وقت تک فرد اور معاشرہ مُغائرت کا شکار رہتے ہیں - اہلِ علم اور اہلِ دل کی اس محفل کے شرکا کی توجہ ایک اہم سماجی ذمّے داری کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور دینی تنظیموں کی زندگی کے بارے میں یکطرفہ پیش رفت کی پالیسی پر نظر ثانی کے لیے درخواست کرنا چاہتا ہوں - میری گزارشات کا محورُ اسلامی نظریۂ تعلیم کے بنیادی ستون اور ہماری ذمّے داریاں ہیں -

اسلامی فکر کے بنیادی منابع قرآن اور احادیث نبوی ہیں - ان منابع سے اسلامی تاریخ میں جس طرح فائدہ اٹھایا گیا اور جس طور انہیں مسلمانوں کی مجلسی زندگی کی رُوح قرار دیا گیا، ان سے ہماری فکری تاریخ کے ثانوی منابع معرضِ وجود میں آئے - ثانوی منابع دراصل ان کوششوں کی عکاسی کرتے ہیں جو ہمارے مشاہیر، مفکّرین اور اولیا نے قرآنی تعلیمات کو اپنانے اور انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں رائج کرنے کے سلسلے میں روا رکھیں قرآنی تعلیمات کا ایک بنیادی وظیفہ کسی ایک فرد کا حقیقت مطلقہ سے تعلق قائم کرنے اور اسی تعلق کی روشنی میں اس کردار کی نشاندہی کرنے سے عبارت ہے جو کسی شخص نے اپنے گرد و پیش میں موجود اشیا، جمادات، نباتات، حیوانات اور دیگر افراد سے روا رکھنا ہے - باری تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے سلسلے کا آغاز خارجی دنیا میں موجود اشیا کے ساتھ ایک خاص رویے کے تحت تعلقات قائم کرنے سے ہوتا ہے اور پھر بعد میں آفاق سے اُنفس کی طرف پیش رفت ہوتی ہے - اس دوسرے مرحلے کی تین سطحیں ہیں - پہلی سطح پر اپنے آپ کو خود اپنے شعور کی روشنی میں دیکھنا ... اپنے ظاہر اور باطن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعی کا جائزہ لینا ہے ... سطح پر اپنے آپ کو دوسروں کے شعور کی روشنی میں دیکھنا ہے ... اوامر و نواہی، اخلاقی ضابطوں اور معاشی قدروں کے حوالے سے ...

کو پرکھنا ہے - اور تیسرے اور آخری مرحلے میں اپنے آپ کو خدا کی ذات کے شعور کی روشنی میں دیکھنا ہے یعنی اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ کس حد تک رضائے الٰہی کے تابع اپنے اعمال، اپنے فیصلے، اپنا اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا کر رکھا ہے - چونکہ اللہ تعالےٰ کی ذات حق و قیوم ہے اسلئے رضائے الٰہی کے تابع فیصلے دراصل تاریخ کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر فیصلے کرنے کے مترادف ہیں - ہم بعض فیصلے وقتی منفعت یا عارضی ہیجانی کیفیات کے دباؤ کے تحت کرتے ہیں - غصے کی حالت میں کئے گئے فیصلے اسی ضمن میں آتے ہیں یا ذاتی دلچسپی کے حصول کے لئے اخلاقی ضابطوں اور قانونی تقاضوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے کئے گئے فیصلے اسی نوع کے فیصلے ہوتے ہیں - دنیاداری کے تمام طریقے ذاتی منفعت کی کسی نہ کسی حالت کی عکاسی کرتے ہیں اور اسی کے تابع ہوتے ہیں - اخلاقی ضابطے بھی عمومی صورتِ حال کے لئے راہنمائی کرتے ہیں اور عام حالات میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے - مگر بعض اوقات انسان ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے جو یکتائی سے متصف ہوتی ہے - ایسی صورت میں اخلاقی ضابطے بھی ناکافی ثابت ہوتے ہیں - حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کا رضائے الٰہی کے لئے قربان کرنے کا حکم ایک ایسا حکم تھا جو کسی اخلاقی ضابطہ کے تحت نہیں تھا -

رضائے الٰہی کی یہ ایک ایسی صورت تھی جسے آنے والی تمام انسانی نسلوں کے لئے ایک روشن مثال بننا تھی - احکام الٰہی کی پابندی کی ایک اور صورت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آتش نمرود میں ڈالا جانا تھا - حضرت اسماعیل اور بی بی ہاجرہ کو مکہ کی بے آباد وادی میں اللہ کے بھروسے پر چھوڑنا بھی رضائے الٰہی کی تکمیل کی ایک انوکھی صورت تھی - ذاتی یا گروہی منفعت کے تصور سے مکمل طور پر بالا ہو کر فیصلہ کرنا، تاریخ کے کٹہرے میں

کھڑے ہو کر فیصلہ کرنے کے برابر ہے یعنی آنے والے تمام تاریخی ادوار کے شعور کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے - آدم گری کی یہ اعلیٰ ترین صورت ہے اور بہت مضبوط شخصیتوں کے مالک افراد ہی اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں - اسلامی فلسفۂ تعلیم کا بنیادی ستون آدم گری کی اسی صورت سے عبارت ہے - نبی کریم کی بارگاہ میں جن صحابہ کرام نے تربیت حاصل کی وہ سب آدم گری کے مراحل سے کامیابی سے گزرے - تعلیم کا بنیادی مقصد معاشرے میں ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو رضائے الٰہی کے تصور سے فیصلے کریں، جو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہیں - تعلیم کے باقی تمام مقاصد پر اس بات کو فوقیت حاصل ہے - صاحبِ ایمان ہونا مضبوط شخصیت کا مالک ہونا ہے مگر آدم گری کی منزل تک ہی رکنا نہیں یہ تو وہ بنیاد ہے جس پر تعلیم کی باقیماندہ عمارت تعمیر کرنا ہے -

قرآن نے آدم کو جو دوسرا فریضہ سونپا ہے اس کا تعلق تسخیرِ کائنات سے ہے - یہ شمس و قمر انسان کے لئے مسخر کئے گئے ہیں - تسخیرِ کائنات کی مہم کا آغاز اپنے جغرافیائی سماجی اور تاریخی ماحول کو پوری طرح گرفت میں لینے سے ہوتا ہے - اور اس کام کی ابتدا حصولِ علم سے ہوتی ہے - اپنے ماحول یا ENVIRONMENT پر کنٹرول، گرفت تجربی علم سے ہی ممکن ہے - تجربی علم، مشاہدے اور تجربے سے عبارت ہے - اس علم کا مقصود قانونِ قدرت کی دریافت ہے تاکہ اپنے گرد و پیش ہونے والے واقعات کے بارے پیش گوئی بھی کی جا سکے اور انہیں جب چاہیں رونما بھی کر سکیں - تجربی علم کے تحت حاصل شدہ معلومات قابلِ اعتماد ہوتی ہیں یہ اس لئے کہ قوانینِ قدرت تمام کائنات میں تواتر اور یکسانیت سے رونما ہوتے ہیں - واقعات پر کنٹرول یعنی ان کے بارے میں پیشگوئی اور انہیں مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لئے رونما کرنا یہ ٹکنالوجی کے تحت آتا ہے -

سائنس اور ٹکنالوجی میں مکمل دسترس حاصل کرنے سے ہی تسخیر کائنات کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے - ہم نے صدیوں سے قرآنی تعلیمات کے اس حصے پر عمل کرنے کا کام مغربی اقوام کو سونپ رکھا ہے -

مذہبی تعلیم کے اداروں میں قرآنی تعلیمات کے پہلے جزو پر ہی توجہ مرکوز کی جاتی ہے اور یہاں پر بھی ہماری کاوش نیم دلانہ ہے - ہماری تعلیمی درس گاہوں میں اسلامی اصولوں پر استوار کی گئی آدم گری کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے - مغربی اقوام نے علم کو قوت گردانا ہے اور اسی اصول پر آج تک کاربند ہیں - اسلام نے علم کو ذمے داری ٹھہرایا ہے اور انسانی فلاح و بہبود کے حصول کو تعلیم کا مقصد قرار دیا ہے - بندے کا اللہ سے تعلق جوڑنا اور علم کو قدرت کے وسائل کا انسانی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنے کا ذریعہ تصور کرنا اسلامی نظریۂ تعلیم کے بنیادی ستون ہیں — قرآن کانفرنس اور ایسے دیگر اجتماعات میں ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ ہمارے ادارے کس حد تک اسلامی فلسفہ تعلیم کے ان بنیادی ستونوں پر استوار کئے گئے ہیں -

از:- پروفیسر مرزا محمد منوّر

آخری قسط

علّامہ اقبال اور کتابِ زندہ

انسان محض مادی وجود نہیں، وہ روح و مادّہ کی یکجائی کا مظہرِ جمیل ہے۔ لہٰذا اس کی بدنی اور روحانی دونوں طرح کی تربیت اور پرورش ضروری ہے۔ اگر محض ایک ہی جانب پلڑا چڑھے تو آدم اس میزانِ اعتدال سے محروم رہ جاتا ہے جس کے بغیر وہ صحیح معنوں میں اپنی تکمیل نہیں کر سکتا۔ روح اگر مادّے کی بالیوں کھینچی ہوئی بدن کے مطالبات کی غلام عاجز ہو کر رہ جائے تو آدم کی منزل خود آگاہی اس سے ہمیشہ دور ہی رہے گی، خود آگاہی تو بیداری روح ہے جس کا مطلب ہے روح کا مغلوب و محکوم نہ ہونا، بلکہ اس کے برعکس غالب و حاکم ہونا۔

آج کے دور کا اجتماعی مزاج مادہ پرستی ہے۔ آدم مٹی سے بنا لہٰذا مٹی ہی کے قرب میں اسے سہولت محسوس ہوتی ہے۔ جسم کی راست وری مٹی کے قرب کی راست ہے مٹی کی سطح سے روح کا اوپر کی طرف اُٹھنا اور بدن کو تعاون کا عادی بنانا بڑا مشقّت طلب سفر ہے۔ مقالے کے آغاز میں بالفاظ حضرت علامہ اور بحوالۂ آیاتِ الٰہی بتایا گیا ہے کہ آدم کو اوپر کی طرف جانا ہے مشقت اٹھا کے جانا ہے ـــ مادّے کی پستیوں سے روح کی بلندی تک کا سفر بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ چنانچہ جب بھی آدم کو مادّی راست کی خواب گیں کیفیت سے جگانے کی کوشش کی جائے تو وہ لے اپنے حق میں عداوت جانتا ہے اور لڑ پڑتا ہے۔ انفرادی زندگی میں بھی اس کا رد عمل یہی ہے اور اجتماعی حیثیت میں بھی۔ لہٰذا ایسی تمام عادتیں اور خصلتیں جو روح کو (بلکہ ساتھ ہی بدن کو بھی) کھا جائیں ترک کر دینی چاہئیں۔ اس جانکاہ و تن فرسا کیفیت کے مقابلے میں ہر بیدار (...)

آجاتی ہے۔ مگر ناآگاہ اور ناخود شناس آدم کے لیے گناہ ہی تو زندگی ہے۔ بری زندگی کی مصلحتیں جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتیں۔ ہر وہ منفعت جو مادی راحت کے وسائل مہیا کرے وہ ٹھیک ہے۔ حتیٰ کہ خود حکومتیں انہی اجتماعی مصلحتوں کے پیشِ نظر ناجائز اور آدم کش مادی ذرائع آمدنی کی پشت پناہی کرنے لگتی ہیں۔ خواہ وہ آمدنی جوئے کی آمدنی ہو اور خواہ شراب کے کاروبار کی آمدنی ہو، خواہ سود کی کمائی یا اس کمائی پر ٹیکس ہو ۔۔۔ وہی تضاد ذہنی پر مبنی ہر دین کی بنیادی تعلیم غلط انفرادی اور اجتماعی رویّے سے ٹکراتی رہی ہے۔ اسلام کی وہ صورت جو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتی ہے، تمام سابقہ ادیان کی آخری ترقی یافتہ صورت ہے اور مادی مصالح کے باب میں اسلام کے رویّے کی روح حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ قول معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی بنا کے بھیجا تھا نہ کہ ٹیکس کلکٹر۔

انسان کے لیے خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ کیا اس مسئلہ خیر و شر کا فیصلہ انسان خود اپنی دانش کے سہارے کر بھی سکتا ہے؟ یہ مسئلہ یوروپ والوں نے فلسفے کے کھاتے میں ڈال دیا۔ یہی کچھ قدیم فلاسفہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ فلاسفہ کے بس کا روگ نہیں۔ انسان اپنا خالق خود نہیں، وہ اپنے امکانات اور اپنی حدود سے بخوبی آگاہ ہو ہی نہیں سکتا، خالق خدا ہے اور خالق ہی اپنی مخلوق کی ہمہ نوعی حیثیت کو بخوبی جانتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "اَلاَ یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟) لہٰذا خیر اور شر کا مسئلہ احکامِ الٰہی کی روشنی میں حل ہونا چاہیئے۔ خدا کی ہدایت ہی اس باب میں معیار ہے۔ جن جن کاموں کے کرنے کا حکم ملا ہے وہ خیر ہیں اور جن جن امور سے منع کیا گیا ہے وہ شر ہیں۔ عباس محمود العقاد لکھتے ہیں۔

> "مکارمِ اخلاق کی بھرپور معیاری مقیاس کا مصدر وحی سماوی ہے جو آدمی کو ارضیت سے بلند کر دیتی ہے" [1]

---

[1] حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ ۔ ص ۳۷۱

آدمی جتنا ارضیت سے قریب ہے اتنا انسانی اعتبار سے غیر ذی حیات ہے۔ قرآن جو آدم کو مٹی سے اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ امر خدائے واحد پر ایمان و یقین کے بغیر عمل میں نہیں آسکتا۔ جب آدمی اپنے مقام کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس پر عیاں ہو جاتا ہے کہ اس کی گذرگاہ کیا ہے، مرحلے کیا ہیں اور منزل کونسی ہے، پھر اسے غیر خدا کی محبت اپنا قیدی نہیں بنا سکتی۔ وہ ہر مخلوق کی اسیری سے اور خصوصاً مادی تقاضوں کی گرفت سے آزاد ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی کسی ملک کا مملوک نہیں ہوتا، وہ مالک ہوتا ہے، اور مالک بھی ایسا جو جانتا ہو کہ اس کے جملہ ممتلکات اللہ ہی کی امانت ہیں۔ وہ بوریا پر ہو تو جب بھی شہنشاہ ہے۔ وہ تخت زر پر ہو جب بھی فقیر ہے، دل میں خدا بس رہا ہو تو فقیری و شاہی ہم معنی کلمات ہیں۔ خود آگاہ ہونا اور ماسوا اللہ کی محبت کا محکوم نہ ہونا عین روح اسلام ہے، علامہ اقبال نے کس خوبی سے شعر ذیل میں یہ مسئلہ بیان کر دیا ہے ؎

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

قرآنی اخلاق (اور ظاہر ہے کہ وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں) ارسطوئی اوسط کے لازماً پابند نہیں۔ "خیر الامور اوسطھا" خود اپنی جگہ عمومی روشن اصول ہے۔ تاہم بعض شعبے ایسے ہیں جو اس اصول سے بے نیاز ہو کر باعث سرور و سرشاری بنتے ہیں۔ مثلاً ایثار یعنی دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا، یہ ایثار — مالی اور جانی ہر طرح کے مواقع سے تعلق رکھتا ہے، سوال یہ ہے کہ ایثار کے جذبے کا اوسط کیا ہوگا۔ حق و صداقت کی پاسداری اور خدمت خلق کے جذبے کی سرمستی کو لیجئے، اس کا اوسط کیا ہوگا؟ حکم حق کی تعمیل میں شوق جہاد کا اوسط کیا ہوگا؟ حیا سر بسر خیر ہے، حیا کا اوسط کیا ہوگا؟ غرض بہت سے امور ہیں جن میں حسابی اوسط کا اصول نہیں چلتا، کسی بزرگ سے کہا گیا "لاخیر فی الاسراف" (اسراف میں کوئی خیر نہیں) انہوں

نے جواب دیا لَا اِسرافَ فِی الخَیر (خیر میں کوئی اسراف نہیں) حضرت صدیقِ اکبرؓ نے ایک جہاد کی تیاری کے موقع پر اپنا سارا اثاثہ حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کر دیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس صدق کا اوسط لیا ہے۔

گویا یوں کہنا چاہیے کہ قرآنی سوچ توازن اور توافق کے مقتضی ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ جو بھی مقام یا صورت حال کا تقاضا ہو وہ پورا ہونا چاہیے اور بھرپور انداز میں، مومن کی زندگی سراسر اسی قرآنی توافق و توازن کی عملی تصویر و تفسیر ہونی چاہیے۔ بقول حضرت علامہ ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

میزان اور شے ہے۔ اوسط اور چیز ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدت حیات کم ہے۔ کائنات کی عمر کے مقابل اس نازک وجود کی بقا تو جنبش مژہ کی نسبت بھی نہیں رکھتی۔ پھر تربیت اور تعلیم اور آدمیت کے اکتساب کا مطلب کیا؟ اگر حیات سچ مچ فانی ہے، آدمی مٹی کا پتلا ہے اور اسے مٹی ہی میں مل جانا ہے۔ تو پھر ان لمبے جھگڑوں میں پڑنے سے حاصل؟ زندگی آئین کی پابندی میں گزرے یا دستور کے انداز میں گزرے گزر ہی جائے گی۔

کیا حیاتِ آدم واقعی فانی و مہمل ہے؟ یہ بات وہ ہے کہ دلِ آدم میں ہر دم کھٹکتی ہے۔ اسی کے ساتھ اتنی ہی پُرخلش یہ الجھن ہے کہ آدمی مرنے کے بعد سچ مچ زندہ ہو جائے گا؟ قرآن نے بارہا تلقین کی ہے کہ بنو آدم ذمہ دار مخلوق ہیں اور انہیں اپنے اعمال خیر و شر کی جزا و سزا کے لیے بحضور خدا آنا ہے، نیز یہ کہ ہر ایک کو اپنا اپنا اعمال نامہ لے کر اکیلے اکیلے حاضر ہونا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ زندگی اس ظاہری موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا، قرآن زندگی کے تسلسل پر روشنی ڈالتا ہے اور زندگی کا تسلسل روحانی ہے، بقول حضرت علامہ ؎

یہ مانا میں نے سمجھا ہوں سخن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے!

اسی طرح حضرت علامہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے

مگر انسان دوبارہ کس طرح زندہ ہوگا؟ قرآن حکیم نے مردہ زمین کی مثال سے سمجھایا ہے جو بارش کی بدولت دوبارہ جان دار بن جاتی ہے اور اس میں نمو کا جوہر پھر اپنا کمال دکھانے لگتا ہے۔

"فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ"[1]

سو ذرا اللہ کی رحمت کے آثار تو دیکھو، وہ کس طرح زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے، بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔

تاہم [illegible] پریشان [illegible] کہ [illegible] ہڈیاں [illegible] چورا چورا ہو جائے گا [illegible] ہو [illegible] تو پھر دوبارہ کیسے [illegible] کا جواب قرآن حکیم اس طرح دیتا ہے:

"قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا
الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ"[2]

"وہ کہتا ہے کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب وہ ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں؟ تو اسے کہہ دے کہ وہی جس نے پہلی بار عدم سے خلق کیا تھا۔"

وہ خدا جس نے آدم کو خلق کیا، اس عالم میں کہ وہ کچھ بھی نہ تھا [illegible] زیادہ

---

[1] قرآن کریم، سورہ ۳۰، آیت ۵۰

[2] " " ۳۶ آیت ۷۹

اللہ آدمی کے بکھرے ہوئے ذرات کو اکٹھا نہیں کر سکتا؟ — بہر حال جو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے وہ مُردے کو بھی جلا سکتا ہے، اگر یوں دیکھیں تو قرآن — یہ کتابِ زندہ — عالمِ انسانیت کی شکستِ آرزو کا واحد علاج ہے، مٹ جانے اور ہلاک ہو جانے کا احساس بے یقینی کی پیداوار ہے، اور حق یہ ہے کہ اس احساس نے اس دور کے مادہ پرست انسان اور وجودی فلسفے کے ہزیمت آموز شعبے کے صیدِ زبوں اہلِ دانش کو زندگی کی بے معنویت کے شعورِ اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ زندگی کی بے معنویت کا نتیجہ فوری اور طویل المیعاد خودکشی ہے، دوسرا عیاشی، تیسرا آدم بیزاری اور آدم کشی —

لب لباب یہ کہ عالمِ انسانیت احترام و مقامِ انسانیت کے شعور سے محروم ہو کر بے یقینی کی لحد میں جیتے جی داخل ہو رہا ہے، مگر وہ شخص جو قرآن پر یقین رکھتا ہو وہ حضرتِ علامہ کی طرح نعرہ زن ہو گا:

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند !
آدم بمیرد از بے یقینی !

اور یہ یقین عطیہ ہے قرآن کا، تحفہ ہے اسلام کا۔

چوہدری مظفر حسین

سائنس اور تبلیغ اسلام

مذاکرہ اسلام اور سائنس ۱۰-۱۲- نومبر ۱۹۸۰ء بمطابق ۱تا۳ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ باہتمام وزارت سائنس و ٹکنالوجی، حکومت پاکستان - اسلام آباد۔

سائنس اسلام کے ساتھ ایسا ناگزیر رشتہ رکھتی ہے کہ اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ یہ جدا بات ہے کہ صدیوں کے سیاسی اور تہذیبی انحطاط کے باعث مسلمان اپنے اس مقدس ورثے سے محروم چلے آ رہے ہیں اور المیہ تو یہ ہے کہ وہ اب اس محرومی پر قانع ہو کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ سائنس اسلام کا جزو لاینفک نہیں۔ میں اس مقالے میں اس موقف کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا کہ سائنس اور اسلام ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں بلکہ موجودہ دور میں سائنس ہی اسلام کی تبلیغ کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

سب سے پہلے تو یہی بات قابل توجہ ہے کہ جس کلمہ طیبہ کو پڑھ کر کوئی شخص اپنے مسلمان ہونے کا اوّلین اقرار کرتا ہے وہ اپنے مضمرات کے اعتبار سے، بجائے خود سائنسی اندازِ فکر ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں کلمہ طیبہ کا پہلا جزو مظاہر فطرت میں سے الوہیت کا جامہ اتار پھینکتا ہے جبکہ اس کا دوسرا جزو ختمیت رسالت کے مفہوم کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی بھی انسان کو منزّہ عن الخطا ماننے سے ممانعت کرتا ہے[1] یہ دونوں ذہنی رویّے انسان کے اندر سائنٹفک سپرٹ ابھارتے ہیں۔ اس طرح ایمان کا پہلا جزو نوش کرتے ہی انسان کے اندر

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔

ایک ایسا اندازِ فکر پیدا ہو جاتا ہے جو اپنے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے سائنس کی مادی ترقی کا باعث بنتا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے متعلق جو دعوے کیے ہیں ان میں سے ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ یہ بصائر کی کتاب (BOOK OF VISIONS) ہے۔[1] اس کی عطا کردہ بصیرتیں انسانی ذہن کی تربیت ایسے خطوط پر کرتی ہیں کہ اس کے اندر خود بخود سائنسی اندازِ فکر اپنانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم انسان کو جس قسم کی مذہبی واردات کے حصول کی تلقین کرتا اور ترغیب دلاتا ہے، اس میں مرئی اور محسوس کائنات کا عمیق مشاہدہ اور ان مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کے ذریعے خدا رسی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔[2] موضوعاتی تجزیے کے اعتبار سے قرآن حکیم کا نواں حصہ ایسی آیات پر مشتمل ہے جو مظاہرِ فطرت کے مشاہدہ و مطالعہ اور ان پر غور و فکر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تمام آیات میں مظاہرِ فطرت کو اللہ تعالیٰ کی ایسی آیات (نشانات) کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسان کے لیے خدا یابی کا ناگزیر ذریعہ ہیں۔

علاوہ ازیں قرآن حکیم ہمیں جو تصورِ کائنات دیتا ہے اس کی رُو سے یہ کائنات، مایا، سراب یا فریبِ نظر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہونے کے حوالے سے ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا ادراک ان اہلِ ایمان کو ہوتا ہے جو زمین و آسمان کی تخلیق میں غور و فکر کرنے کے بعد پکار اُٹھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ تخلیق بے معنی اور بے مقصد نہیں ہو سکتی۔[3] ایک مقررہ مدت کے لیے انسان نے یہیں سے اپنا سامانِ زیست حاصل کرنا ہے۔[4] یہ کائنات اس کی زندگی کو قائم رکھنے

---

[1] القرآن ۶ : الانعام ۱۰۴ ، ۷ : الاعراف : ۲۰۳
[2] القرآن ۱۲ : یوسف : ۵۔
[3] القرآن ۳ : آل عمران : ۱۹۱
[4] القرآن ۲ : البقرہ : ۳۶۔

اور اسے سہارا دینے کے لیے ظاہری اور باطنی نعمتوں سے بھر دی گئی ہے۔ اس کی تمام چیزیں انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں[1]۔ انسان اس زمین پر گویا اختیار مخلوق کی حیثیت سے بسایا گیا ہے[2] اور یہ اس کے عین شایان شان ہے کہ اس میں حسب ضرورت تصرف کر کے اسے اپنی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق ڈھالے کیونکہ یہ اصلاح پذیری کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔

کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت اور مقام کے بارے میں قرآن حکیم کی یہی وہ تصریحات ہیں جن کی بنیاد پر جدید سائنس کا معرض وجود میں آنا ممکن ہوا۔ اور اسی نقطۂ نظر نے مسلمانوں میں سائنسی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کو ایسی بلندیوں سے ہمکنار کیا جس کے تمام مورخین سائنس معترف ہیں۔ سائنس کی خدمات کے صلے میں بریفالٹ اور سارٹن کی تحریریں مسلمانوں کے لیے خراجِ عقیدت سے لبریز ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں تاریخ سائنس پر جو مقالہ شامل ہے، اس کا مصنف مسٹر جیروم آر۔ راویٹز JEROME R. RAVETZ لکھتا ہے:

" اسلامی تہذیب یورپین سائنس کے لیے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر دوسری صدی عیسوی تک اسلامی فتوحات کا دور دورہ رہا۔ عرب حکمران جہاں کہیں آباد ہوئے امن و سلامتی اور خوشحالی و فارغ البالی ساتھ لائے۔ ایران سے لے کر سپین تک کے ممالک میں عربی ہی واحد علمی زبان تھی۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یورپ سے اسلامی تہذیب کا اتصال ایسے وقت میں ہوا جب کہ یورپ کی تہذیب انتہائی پست درجے میں تھی۔ مثال کے طور پر صرف قرطبہ میں پانچ لاکھ کتب پر مشتمل لائبریری موجود تھی جبکہ پائرینیز کے شمال میں واقع پورے یورپ میں فقط پانچ ہزار کتابیں تھیں۔ نویں صدی عیسوی ہی میں بغداد

---

[1] القرآن : ۳۱ لقمان ۲۰

[2] القرآن (۲)۔ البقرہ : ۳۰۔

کے حکمرانوں نے سائنس کا معتد بہ حصہ عربی میں ترجمہ کروالیا تھا۔ اور ان میں ان کے اپنے سائنس دان، علم ریاضی، علم ہیئت، بصریات، علم کیمیا اور علم طب میں اہم پیش رفتیں کر رہے تھے۔

لیکن یہ ترقی دیر تک اس لیے برقرار نہ رہ سکی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اگرچہ نابغہ روزگار مسلمان سائنس دان اپنی اپنی جگہ بڑے تخلیقی کارہائے نمایاں انجام دے رہے تھے لیکن اس کی معاشرتی بنیاد بہت کمزور تھی۔ جس کی وجہ سے ان میں وہ علمی تعاون مفقود تھا جو نچلے درجے کے سائنس دانوں کو بھی مؤثر بنا دیتا ہے[1]

سائنس کے تمام مؤرخین اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ یورپ میں سائنسی علوم کی تشویق و ترویج اسلام ہی کی مرہون منت ہے لیکن یورپ میں عیسائیت کی مذہبی فضا سائنسی علوم کی تشویق و ترویج کے لیے سازگار نہیں تھی۔ آزادئ اظہار رائے پر طرح طرح کی پابندیاں لگا کر پاپائیت نے سائنس کو کچلنے کے لیے ہر قسم کا ظلم روا رکھا۔ گلیلیو جیسے سائنسدانوں پر قائم کیے گئے مقدمات کی تفاصیل تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ ایک طویل عرصے کے تصادم کے نتیجے میں بالآخر وہاں سائنس اور مذہب نے اپنے اپنے لیے الگ الگ راستے اختیار کر لیے۔ چنانچہ مغرب میں سائنس کو کبھی یہ مقام نصیب نہیں ہو سکا کہ وہاں کی تہذیب میں سائنس کا علم خدا جوئی اور خدا رسی کا ذریعہ بن پاتا۔ اس لیے سائنس مظاہر فطرت کے مطالعہ تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

اگرچہ مغرب میں بھی صداقت کی تلاش ہی کو سائنس کا مقصد اول قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کا مذہب کے خدا سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ان کے نزدیک عالم فطرت میں کارفرما خدا گویا مذہب کے خدا سے کوئی الگ تھلگ حقیقت ہے بلکہ وہ اسے خدا کے نام سے موسوم کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں اور اس کے لیے "نیچر" کی مابعد الطبیعیاتی اصطلاح استعمال کر کے ایک مبہم تصور کی تاریکی میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآن حکیم اپنی ابتدائی

[1] ENCYCLOPAEDIA BRITTANICA VOL: 16, Page 368

آیات میں ہی منکرینِ حق کی جو مثال پیش کرتا ہے وہ ان پر پوری طرح صادق آتی ہے:

"ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی۔ اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نورِ بصیرت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔[1]

دورِ حاضر کے نو بہ نو سائنسی انکشافات سے اگرچہ ماحول اچھی طرح روشن ہے لیکن یہ روشنی سائنسدانوں کے اندر وہ بصیرت پیدا نہیں کر سکی کہ انہیں خدا کا عرفان حاصل ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب میں بھی بعض چوٹی کے سائنسدان خدا پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور مذہبی رجحانات رکھتے ہیں لیکن ان کے لیے سائنس کا علمی تجربہ مذہب کے باطنی تجربے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ان کے ہاں مذہب کا خدا اور ہے اور سائنس کا خدا اور کیونکہ وہ توحید کے صحیح تصور سے محروم ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سائنس اخلاقی حدود و قیود سے آزاد ہو گئی ہے جس سے انسان کی فکری اور عملی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔

درحقیقت دورِ حاضر کی تہذیب کا یہی وہ بنیادی عقدہ ہے جس کی گرہ کشائی صرف اور صرف اسلام کے بے مثل عقیدہ توحید کی بدولت ممکن ہے۔ اسلام کا شدت کے ساتھ خدا کی وحدانیت پر اصرار انسان کے خارجی تجربات اور اس کی باطنی واردات کو ایک عضوی وحدت میں سمو کر سائنس کو اخلاقیات کے تابع کر دیتا ہے اور یہ موجودہ سائنسی تہذیب کو تباہی سے بچانے کی واحد تدبیر ہے جس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو اشتراک کی کھلی دعوت دیتا ہے۔

"کہو اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو

---

[1] القرآن - ۲ (البقرہ): ۱۷

اپنا رب نہ بنائے "۔ ؎

قرآن کی یہ پکار سائنس والوں کو اس تنویت (شرک) سے باز رہنے کی دعوت ہے جس میں گرفتار ہو کر انہوں نے مذہب اور سائنس کے الگ الگ خدا ایجاد کر لیے ہیں اور جن کی وجہ سے مادی تقاضوں اور اخلاقی داعیات کا آپس میں کوئی تعلق اور ربط نہیں رہا۔ یہی وہ بنیادی خرابی ہے جس کے نتیجے میں دورِ حاضر کا انسان ایک عذاب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ان حالات میں اسلام کی خالص توحید دورِ حاضر کے انسان کے لیے بڑی اہمیت، افادیت، اور دلکشی رکھتی ہے جو موجودہ دور میں اسلام کی تبلیغ کا سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

سائنس نے جہاں انسانی زندگی کے لیے گوناگوں آسائشیں مہیا کی ہیں وہاں اس کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ اس نے تمام اقوامِ عالم کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا ہے۔ دنیا کا ہر سائنس دان خواہ کسی بھی ملک، مذہب، قوم، رنگ، اور نسل سے تعلق رکھتا ہے سائنس کے فورم پر آ کر کسی بھی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو ایک وسیع تر عالمی برادری کا فرد سمجھتا ہے۔ یوں سائنس ہمیں عالمگیر انسانی وحدت کے اس مقام پر لے آئی ہے جہاں سے پوری دنیا کو اسلامی توحید کا پیغام دیا جا سکتا ہے۔ توحید خالص کا قرآنی تصور سائنس کی زبان میں ڈھل کر ایک ایسے مؤثر، قابلِ فہم اور دلنشیں نظریے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو آج کے انسان کو پوری طرح مطمئن کر سکتا ہے۔ کسی مفکر کا قول ہے کہ سائنس نفسِ انسانی کے تزکیہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے جو دنیا کے اعلیٰ ترین مذہب کے سوا دوسرے تمام مذاہب کو ناممکن بنا دیتی ہے اور اسلام اپنے آپ کو اس کسوٹی پر پرکھنے کے لیے پیش کرتا ہے کیونکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ سائنسی انکشافات ہمیشہ ہمیشہ قرآنی حقائق کی صداقت کا ثبوت فراہم کرتے رہیں گے۔

اسلام اس کائنات کے بارے میں ہمیں جو تصور دیتا ہے اس کے مطابق عالمِ فطرت میں اللہ تعالیٰ کے جاری کردہ غیر متبدل قوانین (سنۃ اللہ) کا فرما

؎ القرآن ۳ (آل عمران) آیہ ۶۴

ہیں [illegible] اس کی قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ کلمات اللہ کا کوئی شمار نہیں [illegible] کی [illegible] تحقیقوں کے مشاہدہ کے لیے قرآن نے انسان کو بار بار ترغیب دی [illegible] سائنسی علوم و فنون کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کے جن نشانات [illegible] کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے ان کی بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ سائنس کے نت نئے انکشافات کی بدولت ایک سے ایک نئی آیت مشاہدے میں آتی رہتی ہے۔ سائنسی دریافت کی حتمیت کا نہ تو کسی نے آج تک دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی ایسا دعویٰ ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کا مرحلۂ تحقیق کبھی طے نہیں ہوتا۔

قرآن کی یہی وہ تعلیمات ہیں جو ایسے تمام تناقضات کو ختم کر دیتی ہیں جو سائنسی اور مذہبی حلقوں کی طرف سے سائنس اور مذہب کی تفریق کو قائم رکھنے کے لیے بطور دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ یہی ہے قرآن کی وہ رہنمائی جس پر عمل پیرا ہونے سے سائنس انسان کو قوت ہی نہیں عشق بھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس قوتِ عالمی اور اخلاقی اقدار کے آج بھی رکھتی ہے اور یہی قرآن کا عطا کردہ انداز فکر ہے جس کو اپنانے سے ایسے سائنس دان پیدا ہوتے ہیں جن کے قلوب علمی ترقی کے ساتھ ساتھ خشیتِ الٰہی کی کیفیات سے بھی لبریز رہتے ہیں۔ آج اسلام کا سائنس سے یہی وہ رشتہ ہے جو دورِ حاضر میں اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کا مؤثر ترین ذریعہ بن کر انسانی تاریخ کا رخ پائیدار امن و سلامتی اور خوش حالی و فارغ البالی کی طرف موڑ سکتا ہے۔

---

۱ القرآن ۔ ۴۸ (الفتح) ۲۳ ۲ القرآن ۔ ۱۹ (مریم) : ۱۰۹

۳ القرآن [illegible]

اِنسان کی حیاتِ صالحہ اور اُس کی طبعی عمر

جس طرح دنیا کی ایک عمر ہے، اشخاص کی ایک محدود زندگی ہے۔ اقوام کی موت و حیات کی ایک مدت ہے۔ یہی حال فضائل و مناقب کا بھی ہے۔

حضرت آدمؑ کا سلسلۂ نسب قیامت تک قائم رہے گا مگر بنی آدم کا حسب چار پشتوں سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ ایک شخص جدّ و جہد کر کے فضائل کا اکتساب کرتا ہے۔ علوم سیکھتا ہے۔ حکومت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ مذہب کا سنگ بنیاد رکھتا ہے۔ اس کا بچہ اس جد و جہد کا ذکر اس کی زبان سے سنتا ہے۔ اُسکے اعمال کو دیکھتا ہے۔ باپ مر جاتا ہے اور وہ انہی طریقوں پر عمل کرتا ہے۔ جن پر باپ نے عمل کر کے یہ بنیاد قائم کی تھی۔ لیکن دیوار میں ذرا سا شگاف ہو جاتا ہے کیونکہ باپ حصول محاسن کا موجد تھا۔ یہ مقلّد ہے۔ اور مقلّد و مجتہد میں فرق ظاہر ہے۔ دو پشت اس طرح گزر جاتی ہے اور شرف خاندانی قائم رہتا ہے۔ تیسری پشت شروع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ خاندان صرف آباء و اجداد کی سنی سنائی باتوں کی تقلید کرتا ہے۔ اسلئے شگاف میں اور زیادہ وسعت پیدا ہو جاتی ہے پھر چوتھی پشت شروع ہوتی ہے اور مغرور انسان، آباء و اجداد کے فضائل اور جد و جہد کا مرقع زریں دیکھتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ اب یہ وراثت دائمی ہے۔ جد و جہد و عمل حق کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب قلعہ مستحکم ہو گیا تو پھر فوج کی کیا حاجت ہے۔ پس وہ ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ حالات دیکھ کر محرکات

و وسائلِ عمل بھی اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور کسی دوسرے خاندان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ وہ خاندان ان حالات و اسلحہ کو لے کر اٹھتا ہے اور قلعہ فتح کر لیتا ہے۔ دیوار دھم سے گر پڑتی ہے اور چار پشت کے بعد اعمال صالحہ کا گھرانہ عموماً دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔

اگرچہ بہت سے خاندانوں کا شرف اس سے زیادہ مدت تک قائم رہتا ہے اور بہت سے خاندان اس سے پہلے بھی برباد ہو جاتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اعمالِ صالحہ کی متوسط عمر یہی ہے۔ قرآن حکیم اور حدیث و تاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

> جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے، وہ جو کچھ (حرمت کے حکم سے پہلے) کھا پی چکے ہیں، اس کے لئے ان پر کوئی گناہ نہیں۔ جبکہ وہ (آئندہ کے لئے) پرہیزگار ہو گئے، اور ایمان لے آئے، اور اچھے کام کئے، اور (جب انہیں کسی بات سے روکا گیا، تو اس سے رک گئے) اور (حکم الٰہی پر) ایمان لائے، اور اچھے کام کئے (اور جب پھر روکے گئے تو پھر بھی) پرہیزکیا۔ اور (حکم الٰہی پر) ایمان لائے اور اچھے کام کئے (تو یقیناً ایسے لوگوں سے ان کی سابقہ باتوں کے لئے کوئی مواخذہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نیک کردار ہیں۔ اور اللہ نیک کرداروں کو دوست رکھتا ہے۔
>
> مائدہ ۹۳

ایمان اور عمل صالح کے بعد ایک درجہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد خدا نے تین بار تقویٰ و ایمان و احسان کی ہدایت کی۔ اس لئے یہ چاروں درجے مکمل ہو گئے۔

چوتھے درجہ پر احسان کا حکم دیا کہ عمل صالح کی تکمیل احسان ہی ہے۔

خدا نے ان مراتب اربعہ کو چند متعین اشخاص کے ساتھ محدود کر دیا ہے۔ لیکن یہ قرآن حکیم کا عام انداز ہے کہ باپ کے اعمال کو اولاد کی طرف منسوب

کر دیتا ہے۔ اس کے بعد تینوں مراتب، نیچے کی پشتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ـــــ!

حدیث شریف میں آنحضرتؐ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے مناقب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"انما الکریم، ابن الکریم، ابن الکریم، ابن الکریم یوسف بن یعقوب۔ شریف، شریف کا بیٹا، شریف کا بیٹا، شریف کا بیٹا یوسف ابن یعقوب"

یعنی آپؐ نے کرم کا انحصار چار پشتوں میں کیا۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت یوسف کے خاندان نے شرافت کی کامل مدت کو پورا کر لیا اور یہی چار پشتوں کی مدت اس کی آخری حد ہے۔

ایک دفعہ نوشیروان نے نعمان سے کہا "کیا عرب میں کوئی قبیلہ سب سے ممتاز ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں!

نوشیروان نے وجہ فضیلت پوچھی؟ نعمان نے جواب دیا "جس خاندان میں تین سردار متصل ہوتے چلے آئیں۔ پھر چوتھے کی باری آئی تو تمام قبیلہ میں وہ خاندان ممتاز خیال کیا جاتا ہے"

نوشیروان نے اس خاندان کو طلب کیا تو آل حذیفہ بن بدر الفزاری نے شرافت کی یہ آخری سند پیش کی۔

اگر سلاطین عالم کے خاندانوں پر نگاہ غائر ڈالی جائے تو وہ بھی اس کی تائید کریں گے اور خلافت راشدہ کا دور تو اس کی واضح مثال ہے۔

"خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم" بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔ پھر وہ لوگ جو اس کے بعد آئیں گے پھر وہ جو اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھے دور کا ذکر نہیں کیا کہ فتنہ و فساد کا زمانہ قابل ذکر نہیں۔

عموماً اقوام کی عمر، اشخاص سے زیادہ ممتد ہوتی ہے۔ یہی حال اخلاق و فضائل کا بھی ہے۔ اشخاص کے ساتھ، ان کے محاسن زندگی

بھی چلے جاتے ہیں۔ لیکن قوم باقی رہتی ہے اور اس کے ساتھ اس کی اخلاقی روح بھی قائم رہتی ہے۔ پس اگر ہم اپنی اخلاقی زندگی کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے اعمالِ صالحہ کو جمہوریت کے قالب میں ڈھال دینا چاہیئے۔ اسلام کے قالب میں فطرتاً یہ روح موجود تھی۔ اس لئے اس کے تمام قوائے طبعی ایک مرکز پر جمع ہو کر جسم کو حرکت دیتے تھے۔ لیکن امتدادِ زمانہ نے اس مرکز کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔ اس لئے شخصیت نے جمہوریت کی جگہ لے لی اور خلافت نے حکومت کی صورت اختیار کر لی۔ جب تک بدن میں قوت تھی مرض کے نتائج علانیہ محسوس نہیں ہوئے۔ لیکن جب جسم کی قوت میں اضمحلال پیدا ہو تو

دفعتاً ظاہر ہو گئے ——— دنیا نے دیکھ لیا کہ مرض نے رطوبتِ غریزی کو خشک کر دیا اور حرارت اصلیہ کا چراغ بجھ گیا۔ اس وقت خدا کا فرشتہ پکارا۔

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس

رطوبت اگر خشک ہو گئی ہے۔ حرارت اگرچہ بجھ گئی ہے۔ مگر جسم باقی ہے اور پھر اسی معجونِ مرکّب سے توانائی حاصل کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر شیر بہادر پنی

تلخیص از البلاغ ,, ۱۹۱۶ء صفحہ ۱۲۱

فہم قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعے کے ضمن میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف

ضرور مطالعہ کیجئے

(کتاب کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں چھپ کر آیا ہے)

اعلیٰ سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب طباعت

ھدیہ: ۱۰ روپے